قال المصنف رحمه الله تعالى:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

كيف كان بدء الوحي إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم

وقول الله جل ذكره:{إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ}[سُورَةُ النِّسَاءِ:163 ١٦٣]

- حدیث نمبر(3)

1-رواۃ الحدیث:

- یحییٰ بن بکیر ابو زکریا، القرشی، المخزومی المصری ت(231ھ)
- لیث بن سعد الفہمی المصری، تبع تابعین میں سے ہیں اور پچاس سے زائد تابعین سے ملاقات کی ہے ت(275ھ)
- عقیل بن خالد الایلی المصری، القرشی، الاموی ت(241ھ)
- محمد بن مسلم بن عبید اللہ ابن شہاب الزہری المدنی صغار تابعین میں سے ہیں ت(124ھ) انکی احادیث کی تعداد تقریباً(2200) کے قریب ہے
- عروہ بن الزبیر رح کا تعارف گزر چکا ہے

2-لطائف اسنادیہ:

- حدیث کی سند ائمہ ستہ کے شرط پر سوائے (یحی) کے وہ بخاری و مسلم کی شرط پر ہیں
- حدیث کے راوی مصریین اور مدنیین ہیں
- اس میں تابعی کی تابعی سے روایت ہے

3-الفاظ معانی:

مِنَ الوَحْيِ: یعنی اقسام وحی میں سے (من) تبعیضیہ ہے

الرُّؤْيَا الصَّادِقَةُ فِي النَّوْمِ: ایک روایت میں (الصالحہ) نیک اور سچی خواب، نیند کا ذکر:

(1) مزید بیان اور تاکید کے لیے ہے

(2) یا پھر ازالہ وھم کے لیے ہے کیونکہ بعض سمجھتے ہیں کہ شاید بیداری میں آنکھ سے کسی چیز کے دیکھنے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کہ غلط ہے

- یہ مدت چھے ماہ ہے

مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ: فلق بمعنی ضیاء(روشنی)اور یہ کسی واضح چیز میں کہا جاتا ہے۔

مکمل معنی ہوگا: "مگر وہ آتی صبح کی روشنی کے آنے کیطرح یعنی واضح، حق اور حقیقت ہوتی گی"

اس میں حکمت: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مانوس کرنا اور اعلانیہ فرشتے کے واسطے سے آنے والی وحی کی راہیں ہموار کرنا تاکہ اچانک آپ زیادہ خوفزدہ نہ ہوں

ثُمَّ حُبِّبَ إِلَيْهِ الخَلَاءُ: محبوب بنادی گئی آپ کے نزدیک خلوت (تنہائی) کیونکہ اس میں دل فارغ ہوتا ہے، مخلوق سے منقطع ہوتا ہے

اس میں خلوت اختیار کرنے کی فضیلت کیطرف اشارہ ہے اگرچہ اس میں تفصیل ہے

امام نووی فرماتے ہیں: "وهو الخلوة، وهي شأن الصالحين وعباد الله العارفين"

اور وہ خلوت (تنہائی) ہے، اور یہ صالحین اور اللہ کے عارف بندوں کا طریقہ ہے۔(شرح صحیح مسلم)

اس عبارت میں (ثم) ترتیب کے لیے ہے اس میں اشارہ ہے کہ خلوت کا محبوب ہونا خوابوں کے بعد ہوا

بِغَارِ حِرَاءٍ: حراء پہاڑ ہے جو مکہ سے تین میل کے فاصلے پر ہے

فَيَتَحَنَّثُ فيه: عبادت کرتے یا دین حنیف ابراہیمی پر عمل کرتے

ذَوَاتِ العَدَدِ: راتوں کا ذکر مناسبت کے لیے ہے ذوات العدد: قلت کے لیے یا کثرت کے لیے ہے اور شاید یہی یہاں مراد ہے بعض روایات ایک ماہ کا ذکر ہے اور بعض نے ماہ رمضان کا ذکر کیا ہے

حَتَّى فَجِئَهُ الْحَقُّ: امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "یعنی آپ ﷺ کے پاس وحی اچانک آگئی، کیونکہ آپ ﷺ وحی کے (اس وقت) منتظر نہ تھے۔ 'فَجِئَهُ' جیم کے کسرہ (زیر) اور اس کے بعد ہمزہ مفتوح (زبر) کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے، اور 'فَجَأَه' جیم اور ہمزہ دونوں کے فتحہ (زبر) کے ساتھ بھی؛ یہ دو مشہور لغات ہیں جنہیں جوہری اور دیگر نے نقل کیا ہے۔"[شرح مسلم]۔

مَا أَنَا بِقَارِئٍ: یہاں 'ما' نافیہ ہے اور معنی یہ ہے کہ "میں پڑھنا نہیں جانتا"۔ بعض نے 'ما'

کو استفہامیہ قرار دیا ہے جس کے معنی ہوں گے: "میں کیا پڑھوں؟" لیکن خبر پر 'باء' کا داخل ہونا اس قول کو ضعیف ثابت کرتا ہے، لہذا پہلا قول ہی درست ہے کہ یہ نافیہ ہے۔

فَغَطَّنِي حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجَهْدَ: 'غَطَّنِي' غین کے فتحہ اور طا کی تشدید کے ساتھ ہے، یعنی "مجھے دبایا"۔ 'غط' کے اصل معنی سانس روکنے کے ہیں۔ 'الْجَهْد' جیم کے فتحہ (زبر) اور ضمہ (پیش) کے ساتھ دو لغتیں ہیں، جس کا معنی 'انتہا' اور 'مشقت' ہے۔ زبر کے ساتھ مطلب ہے "دبانے کی انتہا کر دی" اور پیش کے ساتھ مطلب ہے "مجھ پر مشقت اپنی حد کو پہنچ گئی"۔

(اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ): یعنی آپ اپنی قوت اور قدرت سے نہیں بلکہ اللہ کے حول و قوت سے پڑھیں، جس طرح اس نے آپ کو پیدا کیا وہ آپ کو سکھا بھی دے گا۔

فَرَجَعَ بِهَا رَسُولُ اللهِ ﷺ: یعنی آپ ﷺ ان پانچ آیات کو لے کر یا پورے واقعے کے ساتھ واپس لوٹے۔

تَرْجُفُ بَوَادِرُهُ: 'بوادر' بادرۃ کی جمع ہے، یہ کندھے اور گردن کے درمیانی گوشت کو کہتے ہیں جو عموماً خوف کے وقت لرزنے لگتا ہے۔

زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي: یعنی "مجھے کپڑوں سے ڈھانپ دو اور مجھ پر لحاف اوڑھ دو"۔

الرَّوْعُ: را کے فتحہ (زبر) کے ساتھ، بمعنی "خوف و گھبراہٹ"۔

أَيْ خَدِيجَةُ! مَا لِي: یہ استفہام ہے اور معنی ہے: "مجھے کیا ہوا ہے؟" (یعنی یہ کیا کیفیت ہے؟)۔

لَقَدْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي:

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "اس 'خشیہ' (ڈر) کی مراد کے بارے میں علماء کے بارہ اقوال ہیں"۔ انہوں نے سب سے قوی قول یہ ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ کو اپنی جان کے بارے میں موت، بیماری یا طویل علالت کا اندیشہ ہوا، باقی اقوال پر اعتراضات ہیں۔ [فتح الباری]۔

وَتَحْمِلُ الْكَلَّ: کاف کے فتحہ کے ساتھ، اس کے اصل معنی 'بوجھ' کے ہیں۔ جیسے اللہ کا فرمان ہے: {كَلٌّ عَلَىٰ مَوْلَاهُ} (وہ اپنے مالک پر بوجھ ہے)۔ دوسروں کا بوجھ اٹھانے میں کمزوروں، یتیموں، ضرورت مندوں اور اہل و عیال پر خرچ کرنا وغیرہ شامل ہے جو کہ

مکارمِ اخلاق میں سے ہے۔

وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ: یعنی آپ لوگوں کو وہ مال، نفع اور فوائد عطا کرتے ہیں جو انہیں دوسروں کے پاس نہیں ملتے، اور دوسروں کی مشقت خود اٹھاتے ہیں۔

وَتَقْرِي الضَّيْفَ: یعنی آپ مہمان کی خاطر تواضع اور اکرام کرتے ہیں۔

وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ: 'نوائب' 'نائبہ' کی جمع ہے، جس کا مطلب ہے 'حادثہ' یا 'نازل ہونے والی مصیبت'۔

وَكَانَ امْرَأً تَنَصَّرَ: یعنی ورقہ بن نوفل محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے عیسائی ہو گئے تھے۔

وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعَرَبِيَّ.: بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ "وہ عبرانی لکھنا جانتے تھے اور انجیل سے عبرانی میں لکھتے تھے"۔

امام نووی فرماتے ہیں: "دونوں باتیں صحیح ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ انہیں نصرانیت پر اتنی مہارت تھی کہ وہ انجیل میں تصرف کر سکتے تھے، چنانچہ جہاں سے چاہتے عبرانی میں لکھ دیتے اور جہاں سے چاہتے عربی میں۔" [شرح مسلم]۔

فَقَالَتْ لَهُ خَدِيجَةُ: أَيْ عَمِّ: پہلے ذکر ہوا کہ وہ (ورقہ) حضرت خدیجہ کے حقیقی چچا زاد بھائی تھے نہ کہ چچا۔

امام نووی نے جواب دیا کہ یہ لفظ 'توقیر' (عزت دینے) کے طور پر تھا۔

حافظ ابن حجر نے اس کا رد کیا ہے اور اسے راوی کا وہم قرار دیتے ہوئے کہا: "حضرت خدیجہ کا 'اے میرے بھائی کے بیٹے' (یا ابن عم) کہنا حقیقت پر مبنی ہے، جبکہ مسلم میں 'اے چچا' (یا عم) کا لفظ وہم ہے، کیونکہ اگرچہ توقیر کے طور پر یہ درست ہو سکتا ہے لیکن واقعہ ایک ہی ہے اور مخرج بھی ایک، لہذا اسے حقیقت (بھائی) پر ہی محمول کیا جائے گا۔" [فتح الباری]۔

اسْمَعْ مِنِ ابْنِ أَخِيكَ:

(ورقہ کا نبی ﷺ کو بھتیجا کہنا) اس لیے کہ نبی ﷺ کے والد عبد اللہ بن عبد المطلب اور ورقہ کا نسب 'قصیٰ بن کلاب' پر ملتا ہے، اس لحاظ سے وہ آپ ﷺ کے بھائیوں کے درجے میں تھے، یا پھر ورقہ نے اپنی بڑی عمر کی وجہ سے شفقت کے طور پر ایسا کہا۔ [فتح الباری]۔

هٰذَا النَّامُوسُ الَّذِي أُنْزِلَ عَلَى مُوسَى: 'ناموس' کا مطلب ہے "راز دان" (سر چھپانے والا)، جیسا کہ امام بخاری نے احادیثِ انبیاء میں یقین کے ساتھ ذکر کیا ہے اور جمہور کا بھی یہی قول ہے جسے ابن حجر نے نقل کیا ہے۔

انہوں نے کہا: "یہاں ناموس سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں۔" ورقہ بن نوفل نے (عیسائی ہونے کے باوجود) حضرت عیسیٰ کے بجائے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام اس لیے لیا کیونکہ حضرت موسیٰ کی کتاب حضرت عیسیٰ کے برعکس زیادہ تر احکام پر مشتمل تھی، اور یہی حال نبی کریم ﷺ کا بھی تھا۔ یا اس لیے کہ حضرت موسیٰ کو فرعون اور اس کے ساتھیوں پر عذاب (نقمہ) کے ساتھ بھیجا گیا تھا، اسی طرح نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں بھی اس امت کے فرعون (ابو جہل) اور اس کے ساتھیوں پر بدر کے دن عذاب واقع ہوا۔ [فتح الباری]۔

واللہ اعلم، زیادہ واضح پہلی وجہ ہی ہے کیونکہ وہ عام ہے اور حق کے قریب ہے، خاص طور پر جب بات وحی کی ہو رہی ہو جس کا تعلق کتاب سے ہے جس کی تبلیغ کے لیے وحی کی ضرورت ہوتی ہے۔

يَا لَيْتَنِي فِيهَا جَذَعا: 'فِيهَا' کی ضمیر نبوت کے دنوں اور اس کی مدت کی طرف لوٹ رہی ہے۔ 'جَذَعاً' (جیم اور ذال کے فتحہ کے ساتھ) یعنی "کاش میں ایک توانا جوان ہوتا" تاکہ آپ کی بھرپور نصرت کرتا۔ انہوں نے جوان ہونے کی تمنا اس لیے کی کیونکہ جوانی میں مدد کرنا زیادہ ممکن اور اس میں زیادہ چستی ہوتی ہے۔

أَوَ مُخْرِجِيَّ هُمْ؟: واؤ کے فتحہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ (ایک روایت میں یاء کی تخفیف بھی جائز ہے)۔ صحیح اور مشہور تشدید ہی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا یہ سوال 'استفہامِ انکاری' ہے (یعنی کیا واقعی وہ مجھے نکال دیں گے؟) کیونکہ آپ ﷺ کے اندر نکالے جانے کا کوئی سبب موجود نہ تھا، بلکہ آپ ان مکارمِ اخلاق کے حامل تھے جن کا ذکر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کیا تھا۔

وَإِنْ يُدْرِكْنِي يَوْمُكَ: یعنی اگر میں نے آپ کی بعثت اور دعوت کا دن پالیا۔

أَنْصُرْكَ نَصْرا مُؤَزَّرا: یعنی "میں آپ کی بھرپور اور زبردست مدد کروں گا"۔

ثم لم يَنشَبْ ورقةُ أنْ تُوفِيَ: یعنی "پھر زیادہ دیر نہ گزری کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا"۔ یہ نبی کریم

ﷺ کی (اعلانیہ) نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے۔

* **فَتَرَ الوحْي:** اس سے مراد وحی کا کچھ عرصہ کے لیے رک جانا اور اس کے نزول میں تسلسل کا منقطع ہونا ہے۔

فَاسْتَبْطَنْتُ بَطْنَ الْوَادِي: یعنی "میں وادی کے اندرونی حصے (بیچ) میں چلا"۔

فَإِذَا هُوَ عَلَى الْعَرْشِ فِي الْهَوَاءِ: یہاں 'عرش' سے مراد 'کرسی' ہے جیسا کہ دوسری روایت میں ہے: "وہ آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے"۔

فأَخَذَتْنِي رَجْفَةٌ شَدِيدَةٌ: 'رَجفہ' را کے ساتھ، اور ایک قول کے مطابق واؤ کے ساتھ 'وَجفہ' ہے، دونوں کا معنی ایک ہی ہے یعنی "لرزہ اور اضطراب"۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: {قُلُوبٌ يَوْمَئِذٍ وَاجِفَةٌ} (اس دن دل لرز رہے ہوں گے) اور فرمایا: {يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ} (جس دن لرزانے والی لرزادے گی)۔ [شرح مسلم للنووی]۔

فَجُئِثْتُ مِنْهُ فَرَقا: '**جُئِثْتُ**' جیم کے ضمہ، ہمزہ کے کسرہ اور ثاء کے سکون کے ساتھ، یعنی "میں رعب میں آگیا اور ڈر گیا"۔ بخاری کی روایت میں '**فَزِعْتُ**' (میں ڈر گیا) کے الفاظ ہیں۔ '**الفَرَق**' کے معنی بھی ڈر کے ہیں۔ یہاں مفعول مطلق (مصدر) کا ذکر تاکید اور معنی کی پختگی کے لیے ہے، یعنی "میں بہت زیادہ ڈر گیا یا سخت رعب میں آگیا"۔

زَمِّلُونِي زَمِّلُونِي. فَدَثَّرُونِي: 'زملونی' کا معنی پہلے گزر چکا ہے یعنی "مجھے کپڑوں سے ڈھانپ دو"۔ 'دثار' اس کپڑے کو کہتے ہیں جو بدن سے لگے ہوئے لباس (قمیص) کے اوپر پہنا جائے، یعنی "میرے کپڑوں کے اوپر مزید کپڑے ڈال دو"۔ دونوں کے معنی قریب قریب ہیں۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "علماء کے نزدیک '**المدثر**'، '**المزمل**' سب کے ایک ہی معنی ہیں (یعنی کپڑوں میں لپٹا ہوا)۔" [شرح مسلم]۔

4- فوائد:

- حدیث میں تنہائی (خلوت) اور بندے کے لیے اس کی اہمیت کا ذکر ہے تاکہ وہ (دنیاوی مشاغل سے) فارغ ہو کر عبادت کر سکے۔
- یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کریم میں سے سب سے پہلے جو نازل ہوا وہ (سورہ علق کی آیت) ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ (اپنے رب کے نام سے پڑھئے جس نے پیدا کیا) ہے، اور یہی جمہور علماء کا قول ہے

- اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ استاد کو دورانِ تعلیم ایسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں جو طالب علم کو بیدار کرنے اور اس کی توجہ کو پوری طرح مرکوز کرنے میں زیادہ مؤثر ثابت ہوں۔
- اس حدیث میں ان آیات کی عظمت کا بیان ہے جو قرآن کریم میں سب سے پہلے نازل ہوئیں، کیونکہ یہ قرآن کے بنیادی مقاصد یعنی توحید، احکام اور اخبار (گزشتہ و آئندہ کی خبریں) پر مشتمل ہیں۔
- ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ان آیات کے سب سے پہلے نازل ہونے میں حکمت یہ ہے کہ یہ پانچ آیات قرآن کے تمام مقاصد پر مشتمل ہیں، لہٰذا ان میں 'براعتِ استہلال' (شاندار آغاز) پایا جاتا ہے۔ یہ اس بات کی حقدار ہیں کہ انہیں 'عنوانِ قرآن' کہا جائے؛ کیونکہ کسی بھی کتاب کا عنوان اس کے شروع میں مختصر الفاظ میں اس کے مقاصد کو سمیٹے ہوئے ہوتا ہے۔۔۔ اور ان کے مقاصدِ قرآن پر مشتمل ہونے کی وضاحت یہ ہے کہ تمام قرآنی علوم توحید، احکام اور اخبار ہی کے گرد گھومتے ہیں۔ ان آیات میں (پڑھنے) کا حکم دیا گیا ہے اور آغاز میں اللہ کے نام کا ذکر ہے، جو کہ احکام کی طرف اشارہ ہے۔ ان میں رب کی توحید، اس کی ذات وصفات اور اس کے افعال کا ذکر ہے، جو کہ اصولِ دین (توحید) کی طرف اشارہ ہے۔ اور اس میں اخبار (علمی خبروں) سے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ﴾ 'اس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا' (سورۃ العلق: 5)۔" [فتح الباری (8/718-719)]
- نیز ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ سے آغاز کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ 'بسم اللہ' اس سورت کا (اصلی) حصہ نہیں ہے، کیونکہ اگر ہوتی تو اس کا ذکر کیا جاتا۔ مزید برآں، اس حدیث میں اس آیت کے نزول کا سبب بھی بیان کیا گیا ہے
- اس حدیث میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت، اور شوہر کو درپیش مصائب میں ایک بیوی کے بہترین ساتھ، اسے ثابت قدم رکھنے

اور اس کے خوف کو دور کرنے کا بیان ہے۔ ان کی ذہانت دیکھیے کہ انہوں نے آپ ﷺ کے حسنِ سلوک اور اخلاق سے یہ استدلال کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی تنہا اور رسوا نہیں کرے گا۔

- جب آپ ﷺ خوف کی حالت میں آئے تو انہوں نے آپ کو کمبل اڑھایا، پھر "کلا" (ہر گز نہیں) کہہ کر آپ کے اندیشوں کو رد کیا، پھر خوشخبری سنائی، پھر جس بات کی نفی کی تھی اس پر قسم کھائی اور آپ ﷺ کے بہترین اوصاف وعادات سے دلیل پیش کی۔
- قولی تسلی دینے کے بعد انہوں نے عملی قدم اٹھایا اور آپ ﷺ کو اپنے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں تاکہ آپ ﷺ ان کی بات سن سکیں۔ یوں انہوں نے اپنے شوہر کو درپیش معاملے میں اپنی ذمہ داری کو کمال تک پہنچایا، رضی اللہ عنہا وأرضاہا۔ اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے خود ان کے لیے کامل عورت ہونے کی گواہی دی ہے۔
- اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ بہترین اخلاق اور نیک خصلتیں برے انجام اور مختلف قسم کی تکلیفوں سے نجات کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس میں ان نیک اعمال کی فضیلت بھی ہے جن کا فائدہ دوسروں تک پہنچتا ہے (متعدی نفع)، کیونکہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جن اوصاف کا ذکر کیا اور جن سے استدلال کیا ان میں سے اکثر کا تعلق اسی سے تھا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ: "اللہ بندے کی مدد میں رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔"
- یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ کسی مصلحت (جیسے حوصلہ افزائی یا تسلی) کی خاطر انسان کی منہ پر تعریف کرنا جائز ہے۔
- اس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس شخص کو کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو جس میں خوف یا اضطراب پایا جاتا ہو، یا اسے مشورے کی ضرورت ہو، تو اسے چاہیے کہ وہ اس شخص کو اس سے مطلع کرے جس کی نصیحت، درست رائے اور رہنمائی پر اسے بھروسہ ہو؛ اور (مشورہ کرنے والوں میں) بیوی بھی شامل ہے اگر وہ

ان صفات کی حامل ہو۔

- یہ حدیث علم کی فضیلت پر دلیل ہے، کیونکہ جبرائیل علیہ السلام جو آیات لے کر نازل ہوئے وہ پڑھنے کے حکم اور علم کی اہمیت پر مشتمل تھیں۔"
- حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نبی کریم ﷺ کو ورقۃ (بن نوفل) کے پاس لے جانا اور ان سے سوال کرنا، اہل علم، اہل ذکر اور ماہرین کی طرف رجوع کرنے اور ان سے پوچھنے کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔
- ورقۃ رضی اللہ عنہ کے قول (کاش! میں اس وقت جوان ہوتا) میں اس بات کا جواز ہے کہ خیر کے کاموں کے لیے ناممکن چیز کی تمنا کی جا سکتی ہے؛ کیونکہ ورقۃ نے دوبارہ جوان ہونے کی تمنا کی تھی جو کہ عادتاً ناممکن ہے
- اس میں ورقہ بن نوفل کے ایمان لانے کا تذکرہ ہے۔
- یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ دعوت کی راہ میں آزمائش اور وطن سے نکالا جانا انبیاء کی سنت ہے
- ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ کا نبی کریم ﷺ کے سوال "کیا وہ مجھے نکال دیں گے؟" پر یہ جواب دینا کہ: "ہاں! کبھی کوئی شخص ایسا پیغام لے کر نہیں آیا جیسا تم لائے ہو مگر اس سے دشمنی کی گئی"، اس میں دو اہم باتیں ہیں:

پہلی بات: حق اور باطل کی کشمکش اور اہل باطل کا اہل حق کے ساتھ دشمنی کرنا، ہر دور میں اللہ کی ایک مستقل سنت رہی ہے

دوسری بات: سوال کا جواب دینے والے کو چاہیے کہ اگر مقام و مرتبہ کا تقاضا ہو تو اپنے جواب پر دلیل بھی پیش کرے (جیسا کہ ورقہ نے دلیل دی) [دیکھیے: فتح الباری (1/26)]۔

- اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اور تمام انبیاء کے خواب وحی الٰہی ہوتے ہیں۔
- اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ خوفزدہ شخص سے اس وقت تک سوال نہیں کرنا چاہیے جب تک وہ پر سکون نہ ہو جائے۔
- اس میں اشارہ ہے کہ اعلیٰ اخلاق مصائب اور برائیوں سے سلامتی کا ذریعہ بنتے ہیں۔

- کسی انسان کی منہ پر سچی تعریف کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اس کے مغرور ہونے یا خود پسندی میں مبتلا ہونے کا ڈر نہ ہو۔
- خوفزدہ شخص کی گھبراہٹ کم کرنے، اسے تسلی دینے اور اس کا دل ڈھارس بندھانے کی کوشش کرنا مستحب ہے۔
- مشورہ دینے والے (مشیر) کو چاہیے کہ وہ اپنی رائے واضح طور پر بیان کرے اور اسے قائل کر لینے والے دلائل سے تقویت دے۔